پروفیسر محمد راشد ندوی

مولانا فراہیؒ کے تنقیدی نظریات

"جمهرة البلاغة" کی روشنی میں

دُنیا کی قوموں میں عرب ایک ایسی قوم ہے جو اسلام سے پہلے دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن خدا نے اس کو اپنی بعض ایسی نعمتوں سے نوازا جن کی وجہ سے اپنی معاصر قوموں کے مقابلہ میں وہ ہر طرح ممتاز ثابت ہوئی۔ وہ نعمت زبان و بیان، شجاعت وحمیّت اور سچّائی و سادگی تھی۔ جغرافیائی اعتبار سے وہ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام سے الگ تھلگ تھی اس لیے اس کی مقامی خصوصیات مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئیں۔ اور اسلام سے پہلے عربوں نے اپنی زبان و بیان کو بغیر لکھے ہوئے یا مرتب اصول و قوانین کے اتنا وسیع اور جامع بنایا کہ آج تک زبان و بیان کے جو بھی اصول مرتب ہوئے ہیں ان کا صحیح سرچشمہ ان کی اسی دور کی زبان ہے۔ عربوں کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں میں سب سے آخری نبی کا انتخاب فرمایا اور انھیں کی زبان میں اپنی آخری کتاب نازل فرمائی۔ "اذ بعث فی الأمّیین رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم اٰیاتہ ویزکّیھم ویعلمھم الکتاب والحکمة وإن کانوا من قبل لفی ضلٰل مبین"۔[1] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس قوم میں پیدا ہونا اور آخری کتاب کا ان کی زبان میں نازل ہونا، اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ قوم دنیا کی قوموں میں مجموعی طور پر سب سے افضل و اشرف تھی، کیونکہ آخری نبی کے پیغام کا علمبردار اسی کو ہونا تھا۔ اور کلام پاک کا اس زبان میں نازل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ زبان دنیا کی زبانوں میں ہر لحاظ سے مستحکم اور مکمل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان

---

[1] سورۂ آل عمران - ۱۶۴

کا وہ ذخیرہ جو اسلام سے پہلے کا تھا اسے مسلمانوں نے محفوظ رکھا بلکہ اپنے سینہ سے لگائے رکھا کیونکہ
بغیر اس سرمایہ کے کلام پاک کا اعجاز چاہے وہ ظاہری ہو یا معنوی سمجھا نہیں جاسکتا تھا۔ اسی زبان کے
سہارے اللہ کے احکام جو اس کتاب میں ہیں لوگوں کے ذہنوں میں اترتے اور بستے گئے اور اس کا
پڑھنے والا بے ساختہ کہنے لگا "اِن ھٰذا الاّ سحر یوثر" ۔ [1]

کلام پاک کی بدولت بہت سے علوم وجود میں آئے اور ان علوم میں زمانہ کے لحاظ سے ترقی
ہوتی رہی اس میں قرآن اور اسلام کا معجزہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ وہ عرب جو علوم و فنون، فلسفہ و ثقافت
کے اعتبار سے دنیا کی قوموں میں سب سے پیچھے تھے، کلام پاک کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد
ان کے ظاہری حواس کے ساتھ ساتھ ان کی اندرونی کیفیات میں ہمہ گیر تبدیلی و انقلاب پیدا ہوا، اور
آہستہ آہستہ انھوں نے اسلام کی خدمت کے لیے ان تمام علوم کو حاصل کرنا شروع کیا جو اس کی تبلیغ اور
افہام و تفہیم کے لیے ضروری تھے۔ یہ قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ جو علوم و فنون اسلام کی
بدولت وجود میں آئے، عربوں نے ان میں اپنی ذہانت اور محنت کے جوہر دکھا دیے۔ مثال کے
طور پر فقہ کی تدوین و ترتیب جس انداز میں ہوئی اس کی وجہ سے سو دو سو برس کے عرصہ میں اس قوم
نے فقہ و قانون کے میدان میں دنیا کی دوسری قوموں کو پیچھے کر دیا۔ فقہ اور اصول فقہ کے موضوع
پر جو کتابیں بہت کم عرصہ میں وجود میں آئیں وہ محیر العقول ہیں۔ مثال کے طور پر امام شافعیؒ کی
کتاب الاُم، امام مالکؒ کی مؤطا، امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج، اور امام محمدؒ کی کتاب المبسوط
اپنی جگہ پر فقہ و اصول میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح کلام پاک کے الفاظ و تراکیب
کو سمجھنے کے لیے اور غیر عرب قوموں کو صحیح زبان سکھانے کے اصول اور طریقے، جو بعد میں نحو و صرف
کے نام سے جانے گئے۔ اس موضوع پر زمخشری کی المفصل، سیبویہ کی الکتاب، ابن ہشام کی
مغنی اللبیب ایسی علمی کاوشیں ہیں کہ نحو و صرف کے موضوع پر کام کرنے والے کبھی ان سے مستغنی
و بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح ان علوم کے وجود میں آنے کے بعد فصاحت و بلاغت، عروض
اور تنقید کے علوم کا وجود میں آنا لازمی تھا۔ دیگر علوم کی طرح ان میں بھی مسلمانوں نے اپنی پوری

[1] سورۂ المدثر۔ ۲۴

ذہنی صلاحیتیں لگا دیں لیکن ان علوم میں جو کچھ انھوں نے لکھا ان میں بڑا التباس اور خلط مبحث
رہا ہے۔ جن کے کچھ اسباب ہیں۔

پہلا سبب تو یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کے یہاں نقد و بلاغت کی کوئی بنیاد نہیں تھی
اور نہ اسلام کے آنے کے فوراً بعد یہ فن وجود میں آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقد و بلاغت کے اصول
زیادہ تر ذوق پر مبنی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عربوں کے یہاں نقد و بلاغت کے اصول نہیں تھے لیکن زبان
و بیان کا ملکہ اتنا مستحکم تھا کہ وہ فن کے محاسن کو بڑی آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔ اسی لیے ان کے
سامنے کوئی شعر پڑھا جاتا اور اس میں کوئی بھی سُقم ہوتا تو وہ فوراً اس کی طرف نشاندہی کر دیتے،
گویا اعلیٰ ذوق ہی ان کے یہاں معیار تھا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر انھوں نے قرآن کے اعجاز کو سمجھا اور
محسوس کیا اور ماھٰذا قول البشر، اِن ھو الا سحر یوثر کا ادراک وہی قوم کر سکتی تھی
جو بلاغت کو صحیح معنی میں محسوس کرتی۔ لیکن بعد میں مرور زمانہ سے جب اس ذوق میں آہستہ آہستہ فتور
آتا گیا تو اس وقت کے عرب علماء نے اس فن کو اصول و ضوابط کے دائرہ میں لانے کی کوشش
کی اور اس کے اصول و ضوابط مرتب کرتے وقت انھوں نے دوسری قوموں کے اصولوں کو
سامنے رکھا جو اس فن کے اصولوں کو مرتب کر چکی تھیں۔ اس فن میں سب سے زیادہ جس قوم نے
ترقی کی تھی وہ یونانی تھے۔ ان کے یہاں تقریباً دو سو سال تک علوم و فنون میں ترقی ہوتی رہی اور
اسی کے ساتھ ساتھ فن نقد و بلاغت بھی مرتب ہوا۔ یونانیوں کے آخری مفکر اور ناقد ارسطو نے
یونانی ادب و شاعری اور اپنے پیش رؤں کے افکار و نظریات کو سامنے رکھ کر فن شاعری اور خطابت
پر دو اہم رسالے لکھے۔ یہ دونوں رسالے عربی زبان میں عباسی دور میں منتقل ہو چکے تھے۔

دوسری صدی ہجری کے بعد جب عربوں نے نقد و بلاغت کے اصولوں کو مرتب کرنا چاہا
تو ان کے سامنے دو چیزیں تھیں: ایک تو زمانۂ جاہلیت کی شاعری اور قرآن و حدیث ـــ اور
دوسرے یونانی نقد و بلاغت۔ ان دونوں بنیادوں پر انھوں نے فن نقد و بلاغت کی عمارت
تعمیر کرنی شروع کی۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے یونانی اصول و ضوابط کو پہلے سامنے رکھا اور اس کے
بعد عربی زبان کے سرمایہ سے استفادہ کر کے نقد و بلاغت کے اصول مرتب کرنے شروع کیے اور
یہ چیز ان کے ذہن سے نکل گئی کہ نقد و بلاغت کے اصول جو یونان میں مرتب ہوئے ہیں اس کا

علامہ فراہیؒ کو قرآن مجید سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ انھوں نے علوم قرآن سے متعلق مختلف رسالے لکھے، جن میں قرآن مجید کا اعجاز بھی شامل ہے۔ ان کی کتاب 'جمہرۃ البلاغۃ' اس فن میں ان کی کوشش کا بہترین نمونہ ہے۔ مولانا نے جہاں جاہلی دور کے کلام کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا وہیں نقد و بلاغت پر جو کتابیں ان کے زمانہ تک لکھی گئی تھیں انھیں بھی تعمق کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ مولانا کلام پاک کی فصاحت و بلاغت کو اپنی زبان دانی کی بدولت پوری طرح محسوس کرتے تھے۔ ان کے سامنے کلام جاہلی، کلام مجید اور علمار نقد و بلاغت کی تصانیف تھیں۔

مولانا نے نقد و بلاغت کے اصول کلام جاہلی اور کلام پاک سے مرتب کیے اور پھر انھیں علمار اسلام کی تصانیف کی روشنی میں پرکھنا شروع کیا تو انھیں ہر مرحلہ میں تضاد نظر آیا۔ چنانچہ وہ علمار متقدمین کی تصانیف سے اس قدر بیزار ہوئے کہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ علمائے اسلام نے فن شعر و بلاغت کی بنیاد ارسطو کی کتاب پر قائم کی۔ ارسطو اگر عرب میں پیدا ہوا ہوتا اور کلام عرب کے تتبع اور استقرار کے بعد اس فن کی بنیاد قائم کرتا تو یقیناً کامیاب ہوتا۔ لیکن وہ یونان میں پیدا ہوا، وہیں تربیت پائی، یونانیوں ہی کا کلام اس کے پیش نظر رہا اس لیے شاعری اور فن بلاغت کے جو اصول اس نے قائم کیے وہ یونانی شعرار کے کلام سے مستنبط کر کے قائم کیے۔ یونان میں جو شعر کا بہتر سے بہتر نمونہ سمجھا جاتا تھا وہ ہومر اور سوفوکلیس کی شاعری تھی۔ ان دونوں نے شاعری کی بنیاد مصنوعی قصوں اور حکایتوں پر رکھی تھی۔

فنون لطیفہ کی تدوین کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کا حسن عام طور پر مسلم الثبوت ہوتا ہے اس پر نظر ڈالتے ہیں اور اس کے اجزار کی تحلیل کرتے ہیں کہ اس میں کیا باتیں پائی جاتی ہیں، پھر انھیں چیزوں کو محاسن قرار دے کر کلیات قائم کرتے ہیں۔ یونان میں ہومر اور سوفوکلیس کا کلام فصاحت و بلاغت میں بے نظیر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ارسطو نے تحلیل کر کے دیکھا تو ان کا کلام تمام تر حکایتیں اور افسانے تھے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ یہ حکایتیں واقعی نہیں بلکہ اکثر مصنوعی اور فرضی واقعات ہیں۔ اس سے اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کلام کی اصل خوبی صرف یہ ہے کہ کسی واقعہ کی تصویر کھینچی جائے، واقعہ فی نفسہٖ صحیح ہے یا نہیں، اس سے غرض نہیں۔ ارسطو نے یہ بھی دیکھا کہ جو چیزیں فی نفسہٖ بدصورت اور کریہہ المنظر ہیں ان کی بھی اگر بعینہٖ تصویر کھینچ دی جائے تو طبیعت کو

مزہ آتا ہے۔ اس سے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ واقعہ صحیح ہو یا غلط اگر اس طرح ادا کر دیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جائے تو وہ لائق پذیرائی ہے۔ اس نے یہ خیال قائم کر لیا کہ انسان میں محاکاۃ کا مادّہ تمام حیوانات سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ بچہ وہی کام کرتا ہے جو اوروں کو کرتے دیکھتا ہے۔ اس بنا پر کسی واقعہ کی تصویر کھینچنا انسان کی اصل فطرت کا اقتضا ہے۔ علم فی نفسہٖ ایک مرغوب چیز ہے اور کسی واقعہ کا بیان کرنا بھی ایک طرح کا علم ہے۔ اسی وجہ سے واقعہ نگاری مرغوب عام ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ارسطو نے محاسنِ کلام کی تمام تر بنیادیں انھیں دو اصولوں پر رکھیں اور ان کے خلاف جو باتیں نظر آئیں ان کو رد کر دیا۔ سوفوکلیس پر لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ تم نے لوگوں کے اخلاق و عادات کی جو تصویر کھینچی وہ اصل کے مطابق نہیں ہے۔ تو اس نے کہا کہ، "میں نے ان کا ویسا ہی حُلیہ بیان کیا جیسا ہونا چاہیے نہ کہ جیسا ان کا واقعی حُلیہ ہے۔ ارسطو نے سوفوکلیس کے جواب کو تسلیم کر لیا۔

بلاغت کے سلسلے میں ارسطو کے اس خیال اور نظریہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ ارسطو کے یہاں بلاغت کا مدار کذب، سخن سازی اور مبالغہ پر ہے۔ اس کے خیال کی تردید کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

"انسان فطرتاً ناطق پیدا کیا گیا ہے۔ انسان اور دیگر تمام جانوروں میں جو چیز اصل مابہ الامتیاز ہے اور جس کو منطق کی اصطلاح میں فصل کہتے ہیں، یہی چیز نطق ہے۔ لیکن نطق سے آواز یا لہجہ یا راگ مقصود نہیں۔ یہ چیزیں بلبل اور طوطی میں بھی پائی جاتی ہیں اور انسان سے بڑھ کر پائی جاتی ہیں۔ بلکہ نطق سے یہ مراد ہے کہ دل میں جو خیالات آئیں ان کا اظہار کر سکے۔ عقل کا کام سوچنا اور غور و فکر کرنا ہے۔ غور و فکر سے جو خیال پیدا ہوتا ہے، عقل جب اس کو ظاہر کرنا چاہتی ہے تو نطق ہی کے ذریعہ کر سکتی ہے اس لیے نطق عقل کا آلہ ہے۔ ارسطو کی پہلی غلطی یہ ہے کہ وہ انسان کی اصل فضیلت اور اس کا اصل خاصہ محاکات قرار دیتا ہے۔ حالانکہ یہ خاصہ محاکات نہیں بلکہ نطق ہے۔ محاکات بھی نطق ہی کا ایک نتیجہ ہے، انسان میں قوت نطق نہ ہوتی تو محاکات بھی نہ ہوتی۔ نطق کا کمال دو چیزوں پر منحصر ہے ۔۔ خیالات اور مطالب صحت خوبی سے ادا کیے

جائیں اور جو مطالب ادا کیے جائیں خود بھی عمدہ اور صحیح ہوں۔ ارسطو اور پیروانِ ارسطو کے نزدیک یہ دوسری شرط ضروری نہیں۔ ان کے نزدیک نطق کا کام صرف یہ ہے کہ وہ مضمون کو بعینہٖ ادا کرے، مضمون فی نفسہٖ بُرا ہو یا بھلا، اس سے غرض نہیں۔ قدامہ نقد الشعر میں لکھتا ہے: "اگر کسی شعر میں کوئی بیہودہ اور لغو مطلب ادا کیا گیا ہو تو اس سے شعر کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ شعر کی خوبی کے لیے اس قدر کافی ہے کہ جو مضمون ادا کیا گیا وہ کس خوبی اور لطافت سے ادا کیا گیا۔"

ایک جگہ فرماتے ہیں:

"عام لوگوں کا خیال ہے کہ شاعری کا اصل حسن تشبیہات اور استعارات میں ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ کے مواعظ کو اسی بنا پر ایک قسم کی شاعری سمجھتے ہیں کہ وہ تشبیہات سے مملو ہیں لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ شاعری کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہایت سریع الانفعال اور موسیقی الطبع ہوتا ہے۔ جب اس پر کوئی خاص اثر طاری ہوتا ہے تو نغمہ، وزن اور رقص کی قوتیں جو اس میں فطری طور پر موجود ہوتی ہیں حرکت میں آجاتی ہیں۔ حضرت داؤد پر جب خدا کے احسانات کا اثر غالب آتا تھا تو بے ساختہ وہ وجد میں آکر رقص کرنے لگتے تھے۔ ان کا کلام جس قدر ہے سراپا شعر ہے جو ان کے پُرجوش دل سے بے ساختہ نکلتا تھا۔ اسی بنا پر ان کے اشعار کو مزامیر کہتے ہیں۔ برخلاف ان کے حضرت عیسیٰ پر شاعرانہ احساس غالب نہ تھا اس لیے ان کے کلام میں شاعری کے بجائے حکمت ہوتی تھی۔ ارسطو نے اس بحث میں بھی سخت غلطی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شاعری کے جذبہ کے وقت انسان جو گانے یا ناچنے لگتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نغمہ اور رقص ایک قسم کی محاکات ہے یعنی انسان کے دل میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، آواز و حرکات کے ذریعہ سے وہ ان کی تصویر کھینچتا ہے چنانچہ رقاص جو کچھ گاتے ہیں، حرکاتِ رقص کے ذریعہ سے اس کو بتاتے جاتے ہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے اصل حقیقت یہ ہے کہ جذباتِ انسانی مثلاً رنج، خوشی، تعجب، شوق اور نفرت یہ چیزیں انسان کے دل میں ایک پُرزور حرکت پیدا کرتی ہیں۔ یہی حرکت آواز یا راگ یا

رقص یا طرب بن جاتی ہے، مثلاً انسان کو جب ہنسی آتی ہے تو دل میں ایک قسم کی حرکت پیدا ہوتی ہے، یہی حرکت ہنسی بن جاتی ہے۔ چونکہ یہ آثار حرکات نفسانی کے مشابہ ہوتے ہیں اس لیے وہ حرکات نفسانی پر اس طرح دلالت کرتے ہیں، جس طرح الفاظ معانی پر دلالت کرتے ہیں۔"

مولانا نے اپنی کتاب میں الفاظ و معانی کے فلسفہ اور ان کی ہیئت پر تفصیلی بحثیں کی ہیں اور اسی ذیل میں انھوں نے استعارہ و کنایہ و تشبیہات پر بھی فاضلانہ بحث کی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے بلاغت کے جو اصول مرتب کیے ہیں اس میں بھی وہ بڑی حد تک دیگر علماء بلاغت و نقد سے منفرد نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"کلام جو انسان اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اس کے سامنے کبھی جذبات ہوتے ہیں، کبھی عقل اور کبھی روح اور ہر ایک کے لیے الگ الگ اسٹائل اور اسلوب ہوتا ہے۔ جذبات کو اُبھارنے کی زبان کچھ اور ہوتی ہے، ذہنوں کو متاثر کرنے اور اپنی بات منوانے کی زبان دوسری ہوتی ہے، اور اسی طریقہ سے روح اور وجدان کی زبان و اسٹائل کچھ اور ہوتی ہے۔ اسی میں شاعر یا خطیب کی ذہانت اور مہارت نظر آتی ہے۔ کیونکہ بلاغت کی تعریف یہ ہے کہ جو بات کہی جائے وہ مقتضائے حال کے مطابق ہو۔" [1]

اسی طرح شعر اور نثر بلیغ کے درمیان جو بنیادی فرق ہے مولانا اس کی وضاحت بھی علمی انداز میں کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شعر کے جو بنیادی مقاصد ہیں وہ نثر سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لیے دونوں کا دائرہ الگ الگ ہے، اور اگر دونوں کو خلط ملط کیا گیا تو دونوں کے فرق کو سمجھنے سے ہم قاصر رہ جائیں گے۔ الفاظ کے سلسلہ میں مولانا نے بڑی تفصیلی بحث فرمائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تشبیہات اور استعارات ہی زبان میں بلاغت پیدا کرنے کے لیے ضروری نہیں ہیں بلکہ الفاظ کے ذریعہ سے جو خیالات و معانی کی تصویر بنائی جاتی ہے

---

[1] جمہرۃ البلاغۃ ص ۲۱

وہ استعارہ وکنایہ سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ تشبیہ اور استعارہ کا یہی بنیادی مقصد ہوتا ہے کہ احساسات اور جذبات جو غیر مرئی ہوتے ہیں ان کو مرئی بنادے اور ایسا لگے کہ وہ کاغذ پر یا فضا میں بولتے ہوئے اور رقص کرتے ہوئے نظر آئیں۔ اس سلسلہ میں اموی دَور کے شاعر نصیب کے چند اشعار پیش کیے ہیں:

کان القلب لیلة قیل یغدی   بلیلی العامریة او یراح

قطاة عزّها شرك فباتت   تجاذبه وقد علق الجناح

لها فرخان قد ترکا بوکر   فعشهما تصفقه الریاح

اذا سمعا هبوب الریح نصا   وقد اودی به القدر المتاح

فلا فی اللیل نالت ماترجی   ولا فی الصبح کان لها براح [1]

مولانا نے نقد و بلاغت کے جو اصول اپنی اس مختصر کتاب میں بیان فرمائے ہیں وہ ان کے ادبی اور تنقیدی نظریات کا نچوڑ ہیں۔ ان کی زبان ایجاز پر مبنی ہے، بلکہ ایجاز سے بھی کوئی دقیق لفظ ہو تو ان کی تحریروں کے لیے کہا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی بہت سے اہم مسائل کی طرف وہ صرف اشارہ کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں، حالانکہ وہاں وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مولانا کے ذہن میں مسائل کو بیان کرتے وقت یہ بات رہتی ہے کہ ان کی تحریروں کو پڑھنے والے بھی انھیں کی طرح ان موضوعات پر عالم و فاضل ہوں گے۔ مولانا بہت اچھے معلّم اور استاذ تھے۔ شاید یہ بات ان کے ذہن میں ہو کہ ان کی تحریروں کو پڑھانے والے اساتذہ کو بھی انھیں کی طرح ماہر ہونا چاہیے۔ بہرصورت یہ مولانا کا اپنا انداز تھا۔ چند باتیں مولانا کے نظریات کے سلسلہ میں پیش کردینی ضروری ہیں۔

مولانا نے یہ ایک عام رائے ظاہر فرمائی ہے کہ علمار اسلام نقد و بلاغت کے مسائل میں علمار عجم کے خوشہ چیں رہے ہیں جیسا کہ بلاغت اور نقد کے سلسلہ میں عرب علمار بلاغت مثلاً عبدالقاہر جرجانی یا قدامہ بن جعفر وغیرہ کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں لیکن جاحظ کو

[1] جمہرة البلاغة ص ۴۴-۴۵

انھوں نے بارہا اپنی کتاب میں تقلید سے مبرا رکھا ہے اور اس کو صحیح معنی میں ناقد اور علم بلاغت کا ماہر تصور کیا ہے۔ جاحظ کے علاوہ میری نظر میں بعض علمار اور بھی ہیں۔ مثلاً ابن رشیق القیروانی نے کتاب العمدہ میں، ابوہلال العسکری نے کتاب الصناعتین میں، ابن المعتز نے کتاب البدیع میں، آمدی نے الموازنہ میں، اور جرجانی نے کتاب الوساطة بین المتنبی وخصومه میں، ابن الاثیر نے المثل السائر میں، اور ابوالفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی میں مختلف جگہوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جو رائیں پیش کی ہیں ان میں عربیت کی صحیح روح کارفرما ہے اور ان کے تنقیدی ذوق پر کہیں بھی عجمی اثرات نظر نہیں آتے۔

ابن الاثیر کے سلسلہ میں مولانا شبلی نے الندوہ میں ایک مضمون ۱۳۲۴ھ میں تحریر فرمایا جس میں وہ فرماتے ہیں:

"مسلمانوں نے جو علوم و فنون خود ایجاد کیے جن میں وہ کسی کے مرہون منت نہیں، ان میں فن بلاغت بھی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ اور خود ہم کو ایک مدت تک یہ گمان تھا کہ یہ فن بھی مسلمانوں نے یونانیوں سے لیا ہے۔ ابن اثیر نے المثل السائر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ یونانیوں نے فن بلاغت پر جو کچھ لکھا اگر اس کا ترجمہ عربی میں ہوچکا ہے، میں اس سے واقف نہیں، اور اس لیے اس فن میں جو نکتے اضافہ کیے ان میں کسی کا مقلد نہیں بلکہ خود مجتہد ہوں۔ ابن اثیر نے اپنے آپ کو یونان کے خوشہ چینی کے الزام سے بچالیا۔ لیکن فحوائے عبارت سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ اصل فن یونان ہی سے آیا تھا۔" [1]

مولانا نے جمہرة البلاغة میں متقدمین میں جاحظ، ابن قدامہ اور عبدالقاہر جرجانی کا ذکر مختلف موقعوں پر کیا ہے۔ ان میں وہ جاحظ کے فن بلاغت کے سلسلہ میں نظریات سے کافی متاثر نظر آتے ہیں، بلکہ ان کا کہنا ہے کہ متقدمین میں اگر کسی نے فن بلاغت کو عربی فکر اور مزاج کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے تو وہ جاحظ ہیں۔ مولانا فراہی کی رائے جاحظ کے سلسلہ میں بڑی

[1] مقالات شبلی ج ۲، ص ۴

وقیع ہے۔ نقد و بلاغت کے علماء نے خواہ وہ کسی دَور کے ہوں جاحظ کی علمی اور ادبی کاوشوں کا پوری طرح اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ نثر کے سلسلہ میں جن لوگوں نے متاخرین کے کلام کو بطور نمونہ پیش کیا ہے ان میں جاحظ سر فہرست ہیں۔ جاحظ کے بعد مولانا فراہی نے قدامہ کا ذکر اپنی کتاب میں بارہا کیا ہے۔ مولانا فراہی کے یہاں سب سے معتوب شخصیت قدامہ کی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ پہلا عالم ہے جس نے یونانی فن بلاغت کو عربی میں منتقل کیا اور اس کے اصول و ضوابط کو من وعن قبول کر کے عربی زبان میں مرتب کیا۔ اس سے اس نے فن بلاغت کو ایک طرف مسخ کیا تو دوسری طرف عربی زبان کے مزاج کو اس کے صحیح رُخ سے عجمی رُخ پر لانے کی کوشش کی، اور اگر اس کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی تو عربی زبان کی تاریخ میں عربی زبان و ادب کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ ہوتا۔ مولانا نے قدامہ پر جو نقد کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔

قدامہ کے سلسلہ میں جب ہم دیگر علماء نقد و بلاغت کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب کے یہاں یہ چیز نظر آتی ہے کہ ان میں سے کسی نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا ہے، اور یہ عربی زبان کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ قدامہ کے نظریات اس کی زندگی سے آگے نہیں بڑھ پائے، اور عربی زبان و ادب پر ان کا اثر کسی زمانہ میں نہیں رہا۔ چنانچہ آمدی نے ایک مستقل کتاب قدامہ کی غلطیوں پر مرتب کی جس کا نام اس نے "تبیین غلط قدامة بن جعفر فی کتاب نقد الشعر" رکھا، اور آمدی کی حیثیت تاریخ نقد و بلاغت میں اتنی اہم ہے کہ بعد کے علماء بلاغت نے تنقیدی اصول مرتب کرنے میں ان کی کتاب "موازنة" سے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔ آمدی نے موازنہ میں جہاں ابو تمام اور بحتری کے فن پر سیر حاصل بحث کی ہے وہیں اس نے جا بجا لغت اور ادب کے سلسلہ میں اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔

قدامہ کے بعد علماء میں مولانا فراہی نے جس کا ذکر کیا ہے وہ عبد القاہر جرجانی ہیں۔ مولانا نے ان کی دونوں کتابوں اسرار البلاغة اور دلائل الاعجاز کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن جمہرہ میں جہاں جہاں ان کا ذکر ہوا ہے ان کے نظریات پر تنقید ہی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے مولانا نے عبد القاہر کی اس رائے پر کھُل کر تنقید کی ہے کہ ادب میں اصل چیز معنی و افکار ہیں، الفاظ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مولانا کے یہاں لفظ و معنی میں گہرا تناسب ہے۔ اگر اس مناسبت میں ذرا بھی فرق ہو جائے

تو زبان کی ادبی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ عبد القاہر کی یہ رائے جس کا ذکر مولانا نے کیا ہے اس زمانہ میں اس نے پیش کی تھی جب کہ عربی نثر اپنے صحیح مرکز و محور سے ہٹ چکی تھی اور صنائع و بدائع کا ایسا چلن اور رواج تھا کہ صحیح اور سلیس زبان کو ایک طبقہ ادب کے دائرہ سے خارج سمجھنے لگا تھا۔ مقامات اور رسائل کی زبان الفاظ کے جال میں پھنس کر دم توڑ رہی تھی۔ چنانچہ عبد القاہر جرجانی نے اس طریقہ اور اسٹائل پر ضرب لگانے کی کوشش کی اور زبان کو صحیح رُخ پر لانے کی بنیاد رکھی۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ عبد القاہر جرجانی بارہا اپنی دونوں کتابوں میں انہیں لوگوں کے کلام کے نمونے پیش کیے جو صحیح اور سلیس زبان کے لیے مثال تھے۔ مثال کے طور پر جاحظ۔ وہ جاحظ کی بلاغت اور ان کے علمی انداز کے صرف معتقد ہی نہیں بلکہ ان کے اسلوب اور اسٹائل کے مبلّغ بھی تھے۔ عبد القاہر جرجانی نے اپنی کتاب اسرار البلاغة اور دلائل الاعجاز میں جاحظ کے کلام کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔ لفظ کی حیثیت و اہمیت کے سلسلہ میں انھوں نے اسرار البلاغة میں مختلف مقامات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مشکل اور ثقیل الفاظ کے بجائے اگر آسان اور مانوس، پیچیدہ اور مبہم ترکیبوں کے بجائے سلیس اور شستہ ترکیبیں استعمال کی جائیں تو ان سے زبان و ادب میں فصاحت و بلاغت پیدا ہو سکتی ہے۔ زبان میں فصاحت و بلاغت پیدا کرنے کے لیے اگر ادیب فصل و وصل، تقدیم و تاخیر، ایجاز و اطناب اور استعارہ و تشبیہ کے مواقع کو پوری طرح ملحوظ رکھے تو زبان فصیح سے فصیح تر ہو سکتی ہے۔ اور بقول ڈاکٹر محمد مندور "عبد القاہر جرجانی کے لسانی نظریات کو موجودہ دور کے علماء لسانیات نے پوری طرح سے قبول کیا ہے اور لسانیات کے فن کو آگے بڑھانے میں ان سے پوری طرح فائدہ اٹھایا ہے۔"

بہر صورت مولانا فراہی نے اپنی اس مختصر کتاب میں بلاغت اور نقد نیز لسانیات کے جن موضوعات سے بحث کی ہے اس سے ان کے رچے ہوئے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے اللہ کی کتاب کے اعجاز و بلاغت سے ان کو جو عشق و لگاؤ تھا وہ بھی پوری طرح واضح ہوتا ہے۔ مولانا کو اگر نقد و بلاغت کی اہم کتابیں مثلاً کتاب الصناعتین، کتاب الوساطة بین المتنبی وخصومه للجرجانی، المثل السائر لابن الأثیر اور خود جاحظ کے بہت سے رسائل جو اب تک مخطوط ہیں، دستیاب ہوتے تو مولانا کی یہ کتاب اپنے موضوع

پر آج تک منفرد ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود اس کتاب کو پڑھ کر پوری طرح اندازہ ہوتا ہے کہ ان اشاروں کی روشنی میں نقد و بلاغت کے بہت سے دروازے کھُلے ہیں اور کھُلتے رہیں گے اور یہی چیز ایک بڑے مصنف کی عظمت کی علامت ہے۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ کتاب اس صدی کی پہلی دہائی میں مرتب کی گئی۔ اس وقت ہندوستان میں نقد و بلاغت کی تعلیم و تدریس کا طریقہ بالکل بے جان و بے مقصد ہو چکا تھا۔ مختصر المعانی اور تلخیص المفتاح کے منتخب ابواب جو نصاب تعلیم میں تھے انھیں پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ جہاں تک اس موضوع پر تصنیف و تالیف کا تعلق ہے اس پر کچھ کتابیں ضرور لکھی گئیں لیکن ان کے پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں عربوں کے زمانۂ زوال کے علماء نقد و بلاغت کی کتابوں کی تقلید یا ان پر حواشی کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ خود بلاد عربیہ میں فن بلاغت و نقد کی تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف علماء ہند کی تصانیف سے کسی بھی حالت میں بہتر نہیں تھی۔ اعلیٰ تعلیم کا مرکز جامعہ ازہر تھا۔ لیکن وہاں بھی علمی اور ادبی ذوق کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

میری حقیر رائے میں یہ کتاب عربی زبان میں اس موضوع پر پہلی تصنیف ہے جو مولانا حمید الدین فراہی کے لیے ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کے علماء کے لیے باعثِ افتخار ہے۔